ڈاکٹر شاہد نوخیز اعظمی
شعبۂ فارسی ،مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی، حیدرآباد،انڈیا

فارسی کا فراموش شدہ صاحب دیوان شاعر۔حمیدالدین فراہی

Dr. Shahid Nokhaiz Aazmi
Department of Persion, Molana Azad National Urdu University, Hayderabad, India

Hameed-ud-Din Frahi: An elapsed Persian Poet

Hamiduddin Farahi (1863-1930) was a celebrated Islamic scholar of Indian subcontinent known for his groundbreaking work on the concept of Nazm, or Coherence, in the Quran. He proved himself to be an expert in Arabic and Persian languages, he learnt Hebrew as well.

The two prominent aspects of the person of Farahi are of a scholar and a literary figure. Though his scholarly aspect over shadowed his literary figure but his works bore witness that he could composed poetry both in Arabic and Persian languages in the style of the classical Persian poets even when he was only sixteen years old.

This talent devolved, perhaps, under tutelage and the influence of renowned scholar and his teacher and his cousin Shibli Nu'mani who played much in shaping carving and early flowering of his literary taste and acumen. The author of this article presents a detailed review of Frahi's Persian Divan.

حمیدالدین فراہی ۱۸،نومبر۱۸۶۳ء چہارشنبہ کی صبح کو اعظم گڑھ کے ایک معروف گاؤں 'پھریہا' میں پیدا ہوئے فراہی نسبت کے بارے میں عام خیال یہ ہے کہ یہ پھریہا کو عربی شکل دیکر بنائی گئی ہے اور یہ ان کے مسکن کو ظاہر کرتی ہے لیکن ایک دوسری تحقیق کے مطابق یہ افغانستان کے ایک مقام 'فراہ' کی جانب منسوب ہے جہاں سے یہ خاندان منتقل ہوکر ہندوستان آیا تھا۔حمیدالدین فراہی کے والد کا نام مولوی عبدالکریم تھا جو مغرب ومشرق کی تعلیم سے آراستہ اور قانون کے گریجویٹ تھے حمیدالدین فراہی کی ولادت اور وطن کے متعلق سید سلیمان ندوی 'حمیدالدین فراہی حیات وافکار' کے صفحہ نمبر ۶۴ میں رقمطراز ہیں:

''اعظم گڑھ سے دو اسٹیشن پہلے پھر یہاں ایک گاؤں ہے وہی مولانا کا پدری وطن تھا اسی پھریہا کو عربی شکل دیکر مولانا اپنے نام کے ساتھ کبھی کبھی فراہی لکھا کرتے تھے، مولانا شبلی مرحوم دونوں ممیرے پھپھیرے بھائی تھے مولانا فراہی کے والد عبدالکریم صاحب علامہ شبلی کے ماموں تھے دونوں بھائیوں کی پیدائش چھ برس آگے پیچھے ہوئی مولانا شبلی ۱۲۷۵ھ، ۱۸۵۷ء میں پیدا ہوئے اور حمید الدین صاحب ۱۲۸۰ھ ۱۸۶۳ء میں پیدا ہوئے۔''

حمید الدین فراہی نے ناظرہ قرآن وحفظ قرآن اور فارسی زبان کی ابتدائی تعلیم مولوی محمد مہدی چتاروی سے حاصل کی ہے اور اپنے عزیز خاص نعمانی سے فارسی زبان کی تکمیل کی اور اسی دوران ممتاز عالم مولانا فاروق چریا کوٹی کی عالمانہ صحبتیں بھی نصیب ہوئیں جس سے انکی صلاحیتوں میں نکھار پیدا ہوا مولانا کی تعلیم کیلئے بارے میں مولانا سید سلیمان ندوی 'یادرفتگاں' صفحہ ۱۱۳ پر لکھتے ہیں:

''مولانا نے حفظ شروع کیا اور قرآن مجید کے حافظ ہوئے اور فارسی کی ابتدائی کتابیں اسی ضلع کے ایک دیہات چتارہ کے باشندے مولوی مہدی حسین صاحب سے پڑھی اس زمانہ میں شرفاء کی تعلیم کا فارسی ادب سب سے اہم جز تھا مولانا کو ادبیات سے فطری لگاؤ تھا چنانچہ فارسی زبان اور فارسی ادب کا ذوق بچپن سے ہی انکے اندر نمایاں تھا اس وقت مولانا شبلی مرحوم عربی کی اعلیٰ کتابیں اعظم گڑھ میں مولانا فاروق چریا کوٹی سے پڑھ رہے تھے مولانا فاروق صاحب نے اپنے عہد کے سب سے بڑے عالم ہونے کے ساتھ فارسی کے بھی بہت بڑے ادیب اور استاد تھے حمید الدین صاحب کی آمد ورفت یہاں بھی رہا کرتی تھی اور یہ عالمانہ صحبتیں انکو ملا کرتی تھیں۔''

فارسی تعلیم حاصل کرنے کے بعد فراہی نے عربی تعلیم حاصل کرنی شروع کی علامہ شبلی نعمانی سے اسکی ابتداء کی علامہ شبلی نعمانی کے چلے جانے کے بعد حمید الدین فراہی نے لکھنؤ جاکر فرنگی محل میں مولانا عبدالحئ صاحب فرنگی محلی سے تعلیم حاصل کی اس کے بعد مدرسہ اسلام کراچی سے ان کی مالازمت کا سلسلہ شروع ہوا جہاں وہ ۱۸۹۷ء میں عربی کے استاد مقرر ہوئے اور جنوری ۱۹۰۷ء تک یہاں مقیم رہے اور اسی دوران انکے کلام کا پہلا مجموعہ 'دیوان حمید' کے نام سے شائع ہوا اسکے بعد مولا حمید الدین علی گڑھ چلے آئے اور فروری ۱۹۰۷ء میں ایم۔اے۔او۔کالج کے شعبہء عربی کے اسسٹنٹ پروفیسر مقرر ہوئے اسی شعبہ کے پروفیسر اور صدر جرمن کے مشہور عالم جوزف نے مولانا سے عربی زبان وادب کے میدان میں استفادہ کیا۔اور مئی ۱۹۰۸ء تک یہاں مقیم رہے۔

۱۹۰۸ء میں مولانا حمید الدین فراہی علی گڑھ سے الہ آباد چلے آئے اور میور کالج میں ۱۹۱۴ء تک عربی کے پروفیسر رہے تدریسی مصروفیات کے ساتھ ساتھ تصنیفی وتالیفی سرگرمیاں بھی یہاں جاری رہیں مواعظ سلیمانی کے منظوم فارسی ترجمہ 'خردنامہ' کی ابتداء اسی زمانے کی پیداوار ہے۔

فراہی اسی زمانے میں عربی وفارسی اردو اور ہندی کے بورڈ آف اگزامس کے رکن منتخب ہوئے اسی اثناء میں ریاست حیدرآباد نے مولانا فراہی کی خدمات دارالعلوم حیدرآباد کی پرنسپل شپ کیلئے حاصل کی اور یوپی حکومت کی جانب سے جون ۱۹۱۴ء میں حیدرآباد منتقل ہو گئے اور وہاں ۱۹۱۹ء تک مقیم رہے اگست ۱۹۱۹ء میں مولانا فراہی دارالعلوم حیدرآباد کی ذمہ داریوں سے سبک دوش ہو گئے اور اپنے وطن اعظم گڑھ چلے آئے اور اپنی عمر کا باقی حصہ مدرسۃ الاصلاح سرائے میر کی خدمت میں گزارا اور اسکی خدمت کا ایسا حق ادا کیا کہ یہ مدرسہ انہیں کی نسبت سے مشہور ومعروف ہوا مولانا فراہی ابتدائی دور سے ہی اس مدرسہ سے وابستہ تھے اور ۱۹۱۴ء میں اسکے باضابطہ ناظم منتخب ہوئے اور اس مدرسہ کی تعمیر وترقی اور اسکی تعلیمی سرگرمی کو آگے بڑھانے میں مولانا فراہی کی خدمات بہت ہی نمایاں اور قابل قدر ہیں۔مولانا نے طلبہ واساتذہ میں قرآن فہمی کا ذوق پیدا کیا اور ایک ایسی ٹیم تیار کی جوان منفرد طرز فکر اور تدریس کو رواج دے سکے اور فکر فراہی کی شارح وترجمان بن سکے ان میں مولانا اختر احسن اصلاحی، مولانا امین احسن اصلاحی، خصوصی ذکر کے مستحق ہیں ۱۹۱۷ء میں مولانا فراہی نے فریضہء حج ادا کیا اور حجاز میں قیام

کے دوران بہت سے علماء سے ملاقات ہوئی جن میں علامہ تقی الدین ہلالی، اور مولانا عبیداللہ سندھی بھی شامل تھے۔ حج سے واپس ہونے کے بعد مولانا مدرسہ کی خدمت اور اپنے تصنیفی وتالیفی کاموں میں بدستور مصروف رہے۔ ۱۱، نومبر ۱۹۳۰ء کو اپنے وطن سے دور متھرا شہر میں انہوں نے وفات پائی اور وہیں ان کی تدفین عمل میں آئی۔ متھرا میں انتقال کے متعلق سید سلیمان 'یادرفتگاں' صفحہ ۱۱۱ پر لکھتے ہیں:

''زندگی گمنامی میں گزاری، مرنے کے بعد بھی گمنامی کا گوشہ تلاش کیا۔ متھرا میں جہاں اپنے ایک ہموطن ڈاکٹر سے جو دس برس سے انکے معالج خاص تھے علاج کرانے تشریف لے گئے تھے۔ وہیں انتقال فرمایا عمر شریف سرسٹھ (۶۷) برس کے قریب تھی مگر دائمی دردسر کی شکایت کے سوا قویٰ بہت اچھے تھے۔''

مولانا فراہی کی خصوصیات کا ذکر اور انتقال کا ماتم سید سلیمان 'وفیات' معارف صفحہ نمبر ۵ پر ان الفاظ میں کرتے ہیں:

الصلوۃ علیٰ ترجمان القرآن (مبصر قرآن کی نماز جنازہ) وہ صدا ہے جو آج سے، ساڑھے چھ سو برس بیشتر مصر وشام سے چین کی دیواروں تک ابن تیمیہ کی نماز جنازہ کے لئے بلند ہوئی تھی حق ہے کہ یہ صدا آج پھر بلند ہو اور ہندوستان سے مصر وشام تک پھیل جائے کہ اس عہد کا ابن تیمیہ ۱۱، نومبر ۱۹۳۰ء، جمادی الثانی ۱۳۴۹ھ، کو اس دنیا سے رخصت ہو گیا وہ جس کے فضل وکمال کے مثال آئندہ بظاہر حال عام اسلامی میں پیدا ہونے کی توقع نہیں جسکی مشرقی ومغربی جامعیت عہد حاضر کا معجزہ تھی عربی کا فاضل یگانہ اور انگریزی کا گریجویٹ اور زہد وارع کی تصویر فضل وکمال کا مجسمہ فارسی کا بلبل شیراز عربی کا سوق عکاظ ایک شخصیت مفرد لیکن ایک جہان دانش ایک دنیائے معرفت ایک کائنات علم ایک گوشہ نشین مجمع کمال ایک بے نوا سلطان ہنر علوم ادبیہ کا یگانہ علوم ادبیہ کا خزانہ علوم عقلیہ کا ناقد علوم دینہ کا ماہر علوم القرآن کا واقف اسرار قرآن کا دانائے رموز دنیا کی دولت سے بے نیاز اہل دنیا سے مستغنی انسانوں ردوقبول اور عالم کی داد وتحسین سے بے پروا گوشۂ علم کا معتکف اور اپنی دنیا کا آپ بادشاہ وہ ہستی جو تیس برس کامل قرآن پاک اور صرف قرآن پاک فہم وتدبر اور درس وتعلیم میں محو ہر شئے سے بیگانہ اور شغل سے ناآشنا تھی افسوس کہ انکا علم انکے سینے سے سفینے میں بہت کم منتقل ہوسکا مسودات کا دفتر چھوڑا ہے مگر افسوس کہ اسکے چھپنے اور ربط ونظام دینے کا دماغ اب کہاں جو چند رسالے چھپے وہ عربی میں ہیں جن کے عوام کیا علماء تک ناقدر شناس ہیں انکی زندگی ہمارے لئے سرمایہء اعتماد تھی اور ان کا وجود دارالمصنفین کیلئے سہارا تھا افسوس کہ اعتماد اور سہارا جاتا رہا اور صرف اسی کا اعتماد اور سہارا جاتا رہا اور صرف اسی کا اعتماد اور سہارا رہ گیا جس کے سوا اور کسی کا اعتماد اور سہارا نہیں اس سے زیادہ افسوس یہ ہے کہ یہ ہستی آئی اور چلی گئی لیکن دنیا انکی قدر ومنزلت کو پہچان نہ سکی اور ان کے فضل وکمال کی معرفت سے ناآشنا رہی ۔

تو نظیری ز فلك آمده بودی چو مسیح
باز پس رفتی و کس قدر تو نشناخت دریغ

مولانا فراہی نابغہء عصر اور یگانہء روزگار تھے وہ ایک بیدار مغز اور روشن خیال اور دور بیں انسان تھے ایسے جامع کمالات ہستی صدیوں میں بہ مشکل ہی پیدا ہوتی ہے ان کی ساری زندگی اسلامی شعار کا نمونہ تھی انہوں نے اپنی تحریروں کے ذریعہ عوام اور علماء کے ذہن کو جلاء بخشی ہے انہوں نے ترجمہ تفسیر القرآن عربی وفارسی ادب، انگریزی زبان، علم کلام وفلسفہ، اور تعلیم وتربیت جیسے مختلف میدانوں میں اپنے فضل و کمال کے جوہر دکھائے ہیں انکے معیار تحقیق پر تبصرہ کرتے ہوئے مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی 'ترجمان القرآن' صفحہ ۹۶ پر لکھتے ہیں:

''علامہ فراہی ایک بڑے درجہ کے محقق تھے انہوں نے اپنی تفسیروں میں تفسیر کا ایسا خاص مجتہدانہ اسلوب اختیار کیا ہے جو دوسرے مفسرین کے اسالیب سے بہت کچھ مختلف ہے انکی تحقیقات میں ایسا بیش بہا خزانہ پایا جاتا ہے جن سے کوئی طالب بے نیاز نہیں ہوسکتا۔''

علامہ فراہی کی اصل یادگار ان کا وہ گرانقدر تصنیفی وتالیفی سرمایہ ہے جو تفسیر اصول تفسیر، نظم قرآن، تاریخ قرآن، منطق، حکمت،

فلسفہ،اور شعروشاعری جیسے مختلف موضوعات سے تعلق رکھتا ہے۔انکی بہت سی کتابیں ہنوز زیورطبع سے آراستہ نہیں ہوئیں انہوں نے اپنی زیادہ تر تصانیف میں قرآن کریم سے دلیلیں پیش کی ہیں انہوں نے قرآن کو بنیاد اور مرکز بنا کر دیگر تمام علوم کو اسی کے ماتحت کیا ہے مولانا فراہی کے اس تخیل کی ایک نہایت دلنیش تعبیر مولانا عنایت اللہ سبحانی صاحب 'الاصلاح' صفحہ ۱۱۲ پر کے ان الفاظ میں ملتی ہے:

''تصنیف وتالیف کے میدان کا میں یہ پہلا شہسوار ہے جس کی پہلی اور آخری آرزو یہ تھی کہ قرآن پاک کو بزم علم کا صدر نشین بنایا جائے مسلمانوں کے یہاں جتنے بھی علوم ہیں ان سب کا مرکز ومنبع کتاب الٰہی کو قرار دیا جائے اس کی روشنی میں از سرنو سارے علوم مدوّن کئے جائیں وہ علوم فنون کیا ایک ایسی دنیا بسانا چاہتے تھے جس کے سارے سیارے آفتاب قرآنی کے گرد گردش کرتے ہوں۔''

مولانا فراہی کے متعلق مولانا امین احسن اصلاحی 'مختصر حیات حمید' صفحہ ۵۱ پر رقم طراز ہیں:

''وہ محض ایکیڈمک طرز کے محقق اور مصنف نہیں تھے بلکہ ان کی تمام فکری کاوشوں کے اندر ایک گہرا جزبہ اصلاح کام کر رہا تھا وہ علمی اصلاح سے پہلے فکری اصلاح کو ضروری سمجھتے تھے اور اس فکری اصلاح کی بنیاد انہوں نے قرآن پر رکھی''

ان تمام خوبیوں اور خصوصیات کے علاوہ ایک اور خصوصیت مولانا کی شخصیت میں تھی کہ وہ شعری ذوق بھی رکھتے تھے لیکن ان کی علمی نثر نے اسے پس پردہ کر دیا مولانا فراہی عربی اور فارسی میں صاحب دیوان تھے اور انکے فارسی دیوان کو دیکھنے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ مولانا غزل،قصیدہ،مثنوی وغیرہ جملہ اصناف سخن پر قادر تھے چونکہ مولانا نہایت سادہ مزاج تھے اسلئے ان کے کلام میں جوش ومستی،شوخی ورعنائی کا عنصر کم ملتا ہے اور ان کی شاعری سادگی میں بھی دلفریب ادائیں پوشیدہ رکھتی تھیں اور یہ تمیز کرنا ناممکن ہوتا ہے کہ یہ کلام ہندی نژاد کا ہے یا کسی ایرانی شاعر کا۔ایران کے قدیم اساتذۂ فن کی تمام خوبیاں مولانا کے کلام میں پائی جاتی ہیں۔علامہ شبلی جو فارسی کے بہت بڑے مصنف اور نکتہ سنج شاعر تھے وہ بھی فراہی کی فارسیت کا اعتراف کرتے تھے اور خود پر شاگرد کو ترجیح دیتے تھے۔

ابھی مولانا فراہی کی عمر صرف سولہ برس کی تھی کہ انہوں نے فارسی کے سب سے مشکل گو شاعر خاقانی شروانی کے تتبع میں سلطان عبدالحئ کی مدح میں یہ قصیدہ لکھا جب یہ قصیدہ علامہ شبلی نے اپنے استاد مولانا فاروق چریا کوٹی کو دکھا کر پوچھا کہ آپ کے نزدیک یہ کس کا کلام ہے تو انہوں نے فرمایا کہ یہ تو نہیں بتا سکتا مگر قدماء میں سے کسی کا معلوم ہوتا ہے علامہ شبلی نے فرمایا حمید کا ہے وہ سن کر حیران رہ گئے۔

قصیدہ کے تمہید کے چند شعر ملاحظہ ہوں:

بے جلوہء رخ تو بود مضطر آئینہ
خارا بفگند بہ پیرہن از جوہر آئینہ
گیسوئے ہمچو شب تو بیار اے دہم بصبح
فرمائے تا بیاورد از خاور آئینہ

تمہید کے بعد سلطان کی تعریف ومدح کا آغاز اس طرح کرتے ہیں:

سلطان دین خلیفہء عبدالحمید خاں
کش مثل در جہاں نبود جز درا آئینہ
چشم جہاں ز خاك در شاہ نوروز
بگرف آنچاں کہ ز خاکستر آئینہ

مولانا فراہی کے کلام کی نمایاں خصوصیت ان کی سادگی ہے اور انمیں کوئی شبہ نہیں کہ جو کشش اور حسن سادگی میں ہوتا ہوتا ہے وہ

کسی مصنوعی نقش آرائی یا رنگین بیانی میں نہیں ہوتا ان کے دیوان میں صرف یہ ایک ہی قصیدہ ہے اور بالکل ہی نوعمری میں لکھا گیا ہے۔

مولانا فراہی کی ایک بڑی بہن تھیں جنہوں نے مولانا کی پرورش وتربیت کی تھی ان کی وفات سے مولانا کو بہت صدمہ ہوا چنانچہ مولانا نے اپنے درد وغم کا اظہار ایک مرثیہ میں کیا ہے جو کہ انتہائی پر درد اور اثر انگیز ہے، تمہید کے چند اشعار ملاحظہ ہوں:

کشیدہ اند بریں بوستاں ز خوں رقمے
کہ ہیچ گل نبری بے گزند خار غمے
ز بنك دہد چہ خروشم کنونکہ روز بخشت
برفت ہر سر مہر یك ز نیك دہد قلمے
ز بیش و کم گلہ از دور آسماں چہ کنم
کہ در کفش نبود ذرہء ز بیش و کمے
بہ بیں چہ درد و مرا نیشتر بجاں ز فراہ ست
کہ مرگ خواہدم آتش بجان و مان زدہ است

بہن نے جس والہانہ محبت اور دلسوزی کے ساتھ بھائی کی خدمت کی تھی اس کا اظہار دوسرے بند میں اس طرح فرماتے ہیں:

چہ شکر گوش اے دل کہ حق خدمت او
ز شید مام فزوں ست و سایہء پدرم
ہر آنچہ بود ز خوشخوئی و نکو کاری
بدست تربیت خود سرشت با گہرم

علامہ فراہی کے یہ اشعار درد وغم میں ڈوبے ہوئے ہیں اور ان اشعار میں ان کی غمزدگی صاف نظر آتی ہے اور یہی شاعری کا کمال ہے کہ جو جزبہ جس طرح دل میں پیدا ہوا اسی طرح بنا کسی تکلف کے بیان ہو جائے علاوہ جزبات واحساس کی شدت کے خالص زبان کی لطافت، صفائی، سادگی اور پاکیزگی کے لحاظ سے بھی یہ مرثیہ انتہائی بلند پایہ اور مثالی ہے۔

مولانا فراہی کے دیوان میں غزلوں کی تعداد زیادہ ہے اور ان غزلوں کی روانی وسلاست اور پاکیزگی سے انکی غیر معمولی ذہانت کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ انہوں نے آغاز شباب ہی میں حافظ اور نظیری وغیرہ کی غزلوں پر غزلیں لکھیں۔

خواجہ حافظ کی ایک مشہور غزل ہے:

ساقی بیار بادہ کہ ماہ صیام رفت
درد قدح کہ موسم ناموس و نام رفت

اس غزل پر مولانا فراہی نے ایک غزل اس طرح لکھی ہے:

از من بکوئے زاق فروشاں پیام رفت
کاندر سرم ہوائے مے لعل و فام رفت
این نیہ عمر خود نہ مہ پختہ می دہم
کاں نحیہ دگر بہ ہو سہائے قام رفت

من از کمند حلقه واعظ رمیده ام
دل خستگیش بیں که سکارش فردام رفت
بس آفت خمار کشیدی حمید من
ہا بر مر آر بادهء صافی بجام رفت

اس غزل کی سلاست وروانی وشیرینی یہ بتاتی ہے کہ یہ کسی اہل زبان کی غزل ہے اور خاص کر حافظ کی غزلوں کے رنگوں میں ڈوبی ہوئی ہے لیکن یہ ایک ہندی نژاد حمید الدین فراہی کی غزل ہے۔

فراہی کے کمال کی ایک نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ ان کے کلام میں عربی الفاظ بہت ہی کم ہیں جبکہ یہ عربی کے ایک عالم اور شاعر بھی ہیں اور اس زمانے میں عربی لفظ فارسی سے بہت زیادہ مخلوط ہو گئے تھے ان کو الگ کر کے کلام میں فصاحت کو قائم رکھنا بہت مشکل تھا لیکن عربی الفاظ نہ ہونے کے باوجود ان کے کلام میں فصاحت وسلاست ہمیشہ قائم ودائم رہی۔ خواجہ حافظ کی غزل کا ایک مطلع ہے:

بلبل ز شاخ سرو بگلیا رنگ پہلوی
می خواند دوش درس مقامات معنوی

اس غزل پر فراہی نے ایک غزل سادہ فارسی میں لکھی ہے، پیش خدمت ہے:

در با مداد خواجه به که لعنوی
تابش نوی ز مرغ نواہائے پہلوی
بر خیزد باز بیں که گلستاں برنگ بوست
تا چشم را نواد ہی و مغز را نوی
گیرد سبك شری کم شوریده رہرواں
آگاہ نیست آنکه ز آئین رہروی
گفتار حفظ ار چه رواں تازه می کند
هم گفته حمید دہد ہوش را نوی

یہ پوری غزل سادہ اور شگفتہ فارسی میں ہے اور اس میں ایک بھی لفظ عربی کا نہیں ہے لیکن بندش کی چستی اور انداز کی لطافت بدستور قائم ہے بلاشبہ یہ غزل گفتار حافظ کی یاد تازہ کرتی ہے۔

حافظ شیرازی کے علاوہ نظیری نیشاپوری کی زمین میں بھی مولانا فراہی نے غزل لکھی ہے ان غزلوں میں بھی ان کی لطافت زبان کا یہی عالم نظر آتا ہے۔

ایک شعر نظیری نیشاپوری کا پیش ہے:

دعا کند بوقت شہادتم او را
که ایں دمے است که درہائے آسماں باز است

اس زمین میں مولانا فراہی کے چند اشعار ملاحظہ ہوں:

چوں از دلم بدش صدره نہاں بازست

چه غم از اینکه به ندیش راز یاں بازست
تو غم فرستی و من خرد ہائے جان و خوشم
که درمیانه ماراه ارمغان باز است
ہزار خمکده خون جگر زیاں کردم
دہان دیده به خمیازه ہمچنان باز است

عام طور پر غزل گو شعراء کے کلام میں تسلسل خیال کی مثالیں بہت کم ملتی ہیں لیکن فراہی صاحب نے اکثر غزلوں میں تسلسل خیال سے کام لیا ہے جس سے کلام کی دلآویزی بڑھ گئی ہے مثلاً ایک ہی غزل میں دوست کو مخاطب کر کے زندگی کے مختلف حالتوں کی طرف توجہ دلائی ہے غزل کے طند اشعار ملاحظہ ہوں:

نگار من ن نفسی لطف گلستاں در یاب
ہر آنچه سبزه و گل می دہد نشاں در یاب
ترانه سنجی مرغان بوستاں بشنو
جگر خراش فغاں ہائے دوستاں در یاب
بدست ناز سر نرگس جواں ہر کس
خمار بادهء گساراں سر گراں در یاب
نخست گرمیء ہنگامهء بہاراں بیش
سپس فسردگی موسم خزاں دریاب
حمید گرم ز خود آستیس فشاں بر خیز
ہنوز دور نرفت مست کارواں دریاب

ان غزلوں میں مولانا فراہی کی فارسیت اور قدرت زبان کا حیرت انگیز عالم ہے جس کی مثال کسی ہندی نژاد شاعر میں بمشکل ہی ملتی ہے مولانا فراہی نے اکثر غزلیں چھوٹی چھوٹی بحروں میں لکھی ہیں ان غزلوں میں بھی سلاست وسادگی رواں دواں ہے۔

غزلوں کے علاوہ فراہی کے دیوان میں چند مسلسل نظمیں بھی ہیں ایک نظم پیش خدمت ہے جس میں مولانا فراہی نے چشم بصیرت میں کائنات ارضی کے مختلف مناظر پر غور کرنے کی دعوت دی ہے:

بکشائے بامداد ایں مژگاں را — بگار خوابگاہ و شبستاں را
بیروں خرام و چرخ و زمیں بنگر — بگزار سر به بالین ناداں را
بارے بیرس از دل دانش خواہ — کنز پرسش سست مایه سخنداں را
بویا که کرد یاسمن و گل را — گویا که کرد بلبل خوشخواں را

مولانا فراہی کی یہ طویل فارسی نظم ہے اور پوری نظم میں زبان کی نزاکت جلوہ گر ہے اسی طرح فراہی کی ایک دوسری نظم ہے جس کے چند اشعار حاضر خدمت ہیں:

بنگر اندر جہاں به ژرف نگاہی — تا بدانی سپید راز سیاہ

در نکویان نہفتہ بد باشند — در بدان هم نکو بود گہ گاہ
اے بسا ماہروے تیرہ دروں — وے بسا تیرہ روے دل چوں ماہ
اے بسا رند یار سا جامہ — وے بسا یار سامے رند کلاہ
اے بسا شہر یار دوست تہی — وے بسا رہ نمامے خود گمراہ

اس نظم میں فراہی نے دنیا کی سچائی کا نقشہ کھینچا ہے اور ظاہری وضع قطع اور شکل شباہت کی حقیقت کیا ہے اور اس کا انجام کیا ہوگا بڑے ہی لطیف انداز میں بیان کیا ہے یہ نظم اہل دنیا کی رنگینیوں کی ایک بہترین مثال پیش کرتی ہے۔

قصیدہ، مرثیہ، غزل اور مسلسل نظموں کے علاوہ اس دیوان میں جان و دل، آواز سروش بازگشت، زشتی وزیبائی، نیستی وہستی کے عنوانات سے مولانا فراہی نے مثنوی کے نمونے پیش کئے ہیں جس سے ان کی دقت نگاہ اور نزاکت خیال کا اندازہ ہوتا ہے اور زبان و بیان کی سلاست وشیرینی اہل زبان کو بھی مات کر رہی ہے مثنوی نیستی وہستی میں کمال کا جوہر اس طرح دکھاتے ہیں۔ چند اشعار پیش ہیں:

نیستی تخم است و ہستی شاخ و بر — زندگی چون مرغ و مرگش و بال و پر
تخم ہر مرگے بر آرد زندہ — از پس ہر گریہ زاہد خندہ
تا نگریہ ابر کے خند و چمن — تا نخوشد مغز کے جوشد سخن

مولانا فراہی کے یہ اشعار اس امر کے ثبوت کیلئے کافی ہیں کہ مولانا نہ صرف شاعر تھے بلکہ حکیمانہ نظر بھی رکھتے تھے۔

مولانا فراہی نے سپاس یزدان کے عنوان سے بارگاہ خداوندی میں اپنا جو جزبہ تشکر و نیاز پیش کیا ہے ان کے بھی اشعار ملاحظہ ہوں جو کہ فارسی شاعری میں ایک حسین اضافہ ہے:

اے فرزندہء بلند سپہر — بہ ائے فروزندہء ستارہ و مہر
آفرینندہء جہان از ہیچ — باچنین کاگاہ بیجا ہیچ
پہن تر زاں کشادہ بازار — کہ خرد گرد او کشد پرکار
در محیط کہ کلك صنع نویست — چرخ چون نقطہء نہ نیست نہ تیست
ہر چہ جز تست آفریدہ تست بہ — نیك و بد ہر دور پروریدہء تست
گر چہ پاکان نخواندہ یك رادت — تا مگس هم رسیدہ آوازت
نام تو مرهم است بر دل ریش — یاد تو شمع کلبہء دمرویش

مولانا فراہی کی شاعری کے متعلق مرزا احسان بیگ 'مقالات احسان' صفحہ ۳۵ پر اس طرح لکھتے ہیں:

''اس میں شک نہیں کہ مولانا کے کلام میں خواجہ حافظ کی رقص مستی عرفی کے جوش و بیان یا نظامی کی بلندی تخیل کا سماں نظر نہیں آتا لیکن اس سے انکار نہیں ہوسکتا کہ جہاں تک اس چیز کا تعلق ہے جس کو فارسیت کہتے ہیں اس کی مثال ہندوستانی شعراء تو درکنار ایران کے قدیم اساتذہ فن میں بھی بہت کم نظر آتی ہے۔''